Fikr-o-Nasar (Islamabad) 7:6 (1969)

مستشرقین اور تحقیقاتِ اسلامی

عبدالقدوس ہاشمی

یہ عالم حوادث و واقعات سے پُر ہے۔ ہر صبح کچھ نہ کچھ حوادث اپنے ساتھ لاتی ہے اور ہر روز کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ ان ہی حوادث و واقعات کی ترتیب، ان کے اسباب و علل کی تلاش اور ان کے اثرات و نتائج کی نشان دہی کو تاریخ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس طرح علم تاریخ نام ہے فطرت کے قوانین تکوینی یعنی سنۃ اللہ فی الارض کی شناخت اور اس کے بیان کا۔ ایک مؤرخ یہ بیان کرتا ہے کہ کون سا واقعہ پیش آیا کب اور کہاں پیش آیا اس کے اسباب کیا تھے اور اس کے اثر و نتائج کیا پیدا ہوئے۔

اس طرح جب ہم ماضی پر غور کرتے ہیں تو حسب ذیل سوالات ذہن میں خود بخود ابھرتے ہیں:۔

(۱) کیا یہ واقعہ پیش آیا؟ اس سلسلے میں بیان کرنے والے کا ذریعہ علم، اس کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے متعلق معلومات، واقعہ کے امکان عقلی و امکان عادی کے متعلق تحقیق و تدقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح واقعہ کے لئے ظرف مکان اور ظرف زمان متعین کرنے کا مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے ان تحقیقات کے بغیر یہ یقین نہیں پیدا ہوسکتا کہ حقیقتہً یہ واقعہ ہوا بھی یا نہیں۔

(۲) اس کے بعد یہ مرحلہ پیش آتا ہے کہ واقعہ کے اسباب کیا تھے اور اس کے اثرات کیا مرتب ہوئے اس کی تلاش و تحقیق ایک بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ اگر کوئی محقق اس مرحلہ پر گھبرا کر سہل انگاری سے کام لیتا ہے تو تاریخ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔

ان دونوں قسموں کے سوالات کو حل کرنے کے بعد ہی کوئی بیان تاریخ کا بیان ہوسکتا ہے ورنہ محض افسانہ بلکہ مجلسی لطیفے سے زیادہ اس بیان کی علمی قیمت نہیں قرار پاسکتی۔

مثلاً ایک مستشرق نزول وحی کے دن حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ام المؤمنین

بی بی خدیجہؓ کے مابین اس خلوت کی گفتگو کو نقل کرتا ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المومنینؓ کے سوا کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں ہے اور حوالہ میں یہ لکھ دیتا ہے کہ محمد بن اسحٰق المتوفی ۱۵۱ھ نے یہ گفتگو اپنی کتاب میں لکھی ہے۔

اس گفتگو کی صحت تسلیم کرنے کے سلسلہ میں تاریخ کے ایک طالب علم کے سامنے یہ سوالات آتے ہیں:۔

(۱) کیا خلوت میں کوئی تیسرا شخص موجود تھا؟ روایت کسی تیسرے شخص کی موجودگی سے قطعی انکار کرتی ہے۔

(۲) کیا یہ واقعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی سے بیان کیا۔ کوئی صحابی یہ نہیں بیان کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے یا کسی سے یہ واقعہ بیان فرمایا۔

(۳) کیا یہ واقعہ حضرت ام المومنینؓ نے کسی سے بیان کیا۔ حضرت ام المومنینؓ سے کوئی روایت موجود نہیں ہے۔

ظاہر ہے اب سارا دارومدار محمد بن اسحٰق اور اس کے شیوخ پر رہ گیا۔ عملاً یہ ممکن نہیں کہ خلوت میں اس وقت کوئی شخص موجود ہو۔ پھر علم رجال یہ وضاحت کے ساتھ ہمیں بتا دیتا ہے کہ محمد بن اسحٰق اور اس کے اکثر شیوخ غیر محتاط، قصہ گو اور کہانیاں بنانے والے تھے۔

امام ذہبی نے میزان الاعتدال (ص ۲۲ ج ۳ طبع القاہرہ ۱۳۲۵ھ) میں لکھا ہے:۔

قال یحیی القطان اشهد ان محمد بن اسحٰق کذاب قال ابن معین وهو صالح الحدیث ماله عندی ذنب الا ما قد حشا فی السیرة من الاشیاء المنکرة المنقطعة والاشعار المکذوبة. قال مالك انظروا الی دجال من الدجاجلة۔ دخل رجل معه حبل فوضعه فی عنق ابن اسحٰق فاخرجه فذهب الی السلطان فجلد قال سعید من اجل القدر۔

ذرا غور فرمائیے۔ واقعہ کا ظرف زمان و ظرف مکان خلوت میں کسی راوی کے وجود کو عادۃً ناممکن قرار دیتا ہے خود راوی غیر ثقہ قصہ گو اور بے اعتبار اور بیان واقعہ لفظاً بہ لفظٍ۔ اس واقعہ کی تاریخی قیمت کیا قرار دی جائے؟

اس جگہ ایک کم نظر کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ایسی گفتگو ہونا امکان عقلی و عادی کی حدود میں تو آتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ایسی گفتگو ہوئی ہو۔ لیکن ذرا غور فرمائیے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ غلط فہمی ہے اور فکر کی کمزوری سے پیدا ہوئی ہے۔ کسی حادثہ کا صرف ممکن ہونا، اس کے حقیقتہً واقعہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی شخص یہ بیان کرے کہ جس جگہ پر آج راولپنڈی کا ریلوے اسٹیشن ہے وہاں اس سے پہلے ایک مندر تھا۔ اسے توڑ کر انگریزوں نے ریل کا اسٹیشن بنا دیا تو اگرچہ اس کا امکان عقلی و امکان عادی موجود ہے لیکن جب تک اس کی کوئی شہادت نہ مل جائے صرف امکان کی وجہ سے اسے واقعہ تاریخی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر ایسا ہوا کرے کہ صرف امکانِ واقعہ کو دلیل واقعہ قرار دے دیا جائے تو ہر ناول وافسانہ تاریخ کا مرتبہ پا جائے گا۔ اور تحقیق تاریخی کا سارا دفتر خرافات کا پلندہ بن کر رہ جائے گا۔ شہادت ملنے کے بعد بھی ایک مرحلہ شہادت کی قیمت مقرر کرنے کا رہ جاتا ہے۔ ہر بیان تاریخی قیمت نہیں رکھتا اور نہ ہر شہادت قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔

ایک اور مثال تاریخی تنقیح سے غفلت کی سُن لیجئے۔ اس کے بعد اصل موضوع پر جو ایک مختصر سی گفتگو ہے ہے اس کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ مرحوم ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے جو مصر کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ اور آکسفورڈ کے سند یافتہ ڈاکٹر تھے، اپنے ماہر فن اساتذہ سے کتاب مشاہیر اسلام میں (ص۲۴) میں لکھا ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے سمجھانے سے اسلام قبول کیا اور اس وقت حضرت عثمانؓ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اسی کتاب کے صفحہ (ص۲۳) پر وہ لکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے پانچ یا چھ سال بعد حضرت عثمان پیدا ہوئے۔ رسول اللہؐ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو حضورؐ کا سن مبارک چالیس سال یا اس سے کسی قدر زائد تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس حساب سے حضرت عثمانؓ کا سن ۳۵ یا ۳۴ سال ہونا چاہیئے۔ بیس سال کیسے ہوگا۔

اسی کتاب کے صفحہ ۲۸۰ پر ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی عمر جب سترہ سال کی ہوئی تو ان کے والد بزرگوار ان کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ۱ھ میں بمقام قبا پیدا ہوئے یہ خود اس کتاب کے صفحہ (۲۷۸) پر موجود ہے اور سارے مورخین کے نزدیک مسلم ہے۔ حساب کر کے دیکھئے کہ عبداللہ بن زبیر کی عمر کا گیارھواں سال شروع ہی ہوا تھا یا شائد دو دن ابھی دس سال کے پورے ہونے ہی کو باقی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے

یہ کہاں ممکن ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے ۷ سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں حاضر ہو کر بیعت کی ہو۔

روایات تاریخی کی تنقیح اور اشخاص و اوقات کی تعیین میں غفلت نے کیسی مضحکہ خیز غلطیاں سرزد کرا دیں۔ ان دونوں روایتوں میں فاضل مورخ نے ایک عثمان کو دوسرے عثمان سے اور ایک عبداللہ بن زبیر کو دوسرے عبداللہ بن زبیر سے خلط ملط کر کے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ شائد فاضل مصنف اور ان کے نامور اساتذہ نے علم الرجال کا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ اس طرح کی غلطی سرزد نہ ہوتی۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں آپ تلاش کریں تو اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ناقص مطالعہ کو کافی سمجھ کر لکھنے اور روایات کی تنقیح و تحقیق کے بغیر انہیں نقل کر دینے سے کیسی عجیب عجیب قسم کی غلطیاں بڑے بڑے نامور حضرات سے بھی ہو جاتی ہیں۔

خدانخواستہ یہ مقصود نہیں ہے کہ کسی کے علم کی تقلیل یا اس کے کارناموں کی توہین کر کے اپنی بڑائی ثابت کی جائے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ میرا یا کسی شخص کا بیان بغیر ضروری تنقیح کے قابل قبول نہیں ہوتا۔ یہ لازم ہے کہ اچھی طرح جانچ پڑتال کر لی جائے۔ اور یہ تو صرف ان غلطیوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے، جو اقتضائے بشری یا ناقص مطالعہ سے سرزد ہو جاتی ہیں لیکن اگر محقق کی نیت کا کھوٹ اور مقصد کی قباحت بھی تحقیق و تحریر کے ساتھ مل جائے تو پھر اس کے کرشمے بہت عجیب اور حد درجہ گمراہ کن ہوتے ہیں اگر مقصد ہی یہ ہو کہ کسی مذہب کو یا کسی قوم کو حقیر اور قابل نفرت ثابت کیا جائے تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

خرد کا نام جنوں اور جنوں کا نام خرد　　جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

علامہ برو کلمان مشہور جرمن مستشرق ہماری صدی کے سب سے بڑے مستشرق اور بلاشبہ عربی ادبیات کے بے مثال عالم ہیں۔ انھوں نے عربی کتابوں کی ایک ایسی جامع اور معلومات افزا فہرست تیار کی ہے کہ دوسری کوئی کتاب اس موضوع پر اس کے مقابلہ میں نہیں پیش کی جا سکتی۔

ابن الندیم کی فہرست مصطفی طاش کبری زادہ کی مفتاح السعادہ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اسمٰعیل پاشا کی الدر المکنون اور ہدیۃ العارفین اور یوسف الیان سرکیس کی معجم المطبوعات سے بھی علامہ برو کلمان کی تاریخ ادبیات عرب کا مرتبہ بعض اعتبار سے بلند ہے۔ آج کسی ایسے کتب خانہ مشرقیات کا تصوّر بھی ممکن نہیں جس میں علامہ برو کلمان کی یہ بے بہا کتاب اور اس کے ضمیمے موجود نہ ہوں۔

لیکن یہی علامہ بروکلمان جب ایک پختہ یورپین بن کر اور یورپین اقوام کے ترجیحی مزایا و مناقب کے جذبات کو اپنے سینہ میں لے کر تاریخ مسلمانانِ عالم لکھتے ہیں تو ایسی بے سروپا باتیں لکھتے چلے جاتے ہیں کہ بہت سی مملکتوں کو ان کی کتاب کا داخلہ اپنے ممالک میں بند کر دینا پڑا۔ چنانچہ پاکستان میں بھی اس کتاب کا داخلہ بند ہے۔ میں نے یہ کتاب پڑھی ہے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عربی کتابوں کا یہ عظیم المرتبت کتاب شناس کتابوں کا نام بتاتا ہے۔ مصنف کا نام اور اس کا سنہ وفات بتاتا ہے کتاب کس کس کتب خانہ میں اور کہاں کہاں موجود ہے یہ بھی بتا دیتا ہے لیکن کبھی کتابوں کو کھول کر پڑھتا کیوں نہیں۔ اوّل تو کتابیں پڑھیں بہت تھوڑی جو پڑھیں ان کی روایات پر غور نہیں کیا۔ پھر اسباب و نتائج ایسے پیدا کر لئے کہ کسی شخص کے حاشیۂ خیال میں ایسے عجیب و غریب اسباب و نتائج نہیں آ سکتے آخر ایسا ہوا کیوں؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تاریخ مسلمانان عالم لکھتے ہوئے ان کا ذہن ایک متعصّب کا ذہن تھا اور ان کے قلب و دماغ پر یورپین اقوام کی برتری کے تصوّرات کا قبضہ تھا۔

میں اس جگہ کچھ اقتباسات اس کتاب سے پیش کرتا لیکن چونکہ اس کا اقتباس پیش کرنا قانوناً ممنوع ہے اس لئے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ پوری کتاب دُور از کار قیاسات اور بے سروپا باتوں سے بھری پڑی ہے۔

استشراق کی ابتداء

یہودیوں اور عیسائیوں کا واسطہ مسلمانوں سے بالکل ابتدائی دَور ہی میں ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیّبہ کے مکّی دَور ہی میں یہودی اور عیسائی دین اسلام پر اعتراضات کی ابتدا کر چکے تھے اور مخالفت کرنے میں وہ قریش کے بُت پرستوں کے ہمنوا تھے۔ مدینہ منورہ کے دس سالہ دَور میں یہ مخالفت اور زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ خصوصاً یہودیوں کی مخالفت اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ قرآن حکیم کے وحی الٰہی ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی صادق ہونے کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات ان کی طرف سے ہوتے رہے۔ قرآن مجید کی مکّی اور مدنی آیتوں میں ان کے بعض اعتراضات اور جوابات کا ذکر موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت صدّیقی و فاروقی میں ان لوگوں سے مسلمانوں کو ہر جگہ واسطہ پڑا۔ اور عراق و شام کی فتوحات نے تو آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کی راہیں پوری طرح کھول دیں۔ عیسائی علمائے مذہب نے اسی زمانہ سے بطور مہم کے اسلام اور اس کی تعلیمات سے واقفیت پیدا کرنے اور قرآن مجید اور سیرۃ رسول کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی ابتدا کر دی تھی مگر اس زمانہ میں ان کی طرف خود مسیحی لوگ بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بازنطینی حکومت کی

سخت گیری کے مقابلہ میں مسلمانوں کی رواداری اور آزادی نے مفتوحہ علاقوں کی غیر مسلم آبادی کے لئے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ لوگ مسلمان فاتحین کی آمد کو خدا کی رحمت سے تعبیر کرتے تھے اور متعصب مذہبی پیشواؤں کی طرف کم ہی توجہ کرتے تھے۔ اس زمانہ میں لوگ جوق جوق مسلمان ہوتے جاتے تھے۔ مصر و شام کے عیسائی اور یہودی علماء اور پیشوایان مذہب اس کے مقابلہ میں بے دست و پا سے ہو گئے تھے۔

ولید بن عبدالملک (۸۶-۹۶ھ) کے دور میں کاشغر، بخارا اور سندھ فتح ہو گیا اور اسی زمانہ میں اندلس بھی ممالک اسلامیہ میں شامل ہوا۔ اب اہل یورپ سے مسلمانوں کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا اگرچہ اس سے پہلے بھی یورپ کے زائرین بڑی تعداد میں بیت المقدس میں کنیسہ، قیامت اور ولادت گاہ مسیح کی زیارت کے لئے جاتے تھے بلکہ بہت سے یورپین طلباء بیت المقدس اور دمشق میں رہ کر علم حاصل کرتے تھے مگر ان کا تعلق اتنا گہرا اور ایسا دوامی نہ ہوتا تھا جیسا کہ اندلس کی فتح کے بعد سے ہو گیا۔

تفصیلات کے بیان کا یہ موقع نہیں غرض یہ ہے کہ یورپ کے طالبانِ علم کا تعلق اور عیسائی و یہودی پیشوایانِ مذہب کی اسلام کے خلاف علم فلسفہ اور تحقیقات کے نام سے مساعی بالکل ابتدائی دورِ اسلامی ہی سے جاری تھیں اور آج تک جاری ہیں اس لئے ہم تاریخ کے کسی خاص وقت کو اس جد و جہد کا نقطۂ آغاز قرار نہیں دے سکتے۔ البتہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کے طریقے بدلتے رہے۔ مقاصد میں اگرچہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن کلیسا کا زور ٹوٹنے کے بعد سے کچھ ایسے مستشرقین ضرور پیدا ہوئے، جنہوں نے جرأت کے ساتھ اپنے ہی اساتذہ کی پھیلائی ہوئی بہت سی باتوں کو غلط قرار دیا اور پوری قوت کے ساتھ ان کی تردید کی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس تردید سے ان کا مقصد سچ کو سچ کر کے دکھانا تھا یا خود اپنی طرف سے پیدا کئے ہوئے شکوک کو قابل قبول قرار دینا تھا۔ اس لئے کہ ان تردید کرنے والوں میں سے اکثر نے جہاں اپنے پیشرو مستشرقین کے کذب و افتراء کی پوری قوت کے ساتھ تردید فرمائی ہے وہاں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ اور اتنی معصومیت کے ساتھ دبی زبان میں کوئی نہ کوئی نئی بات کہہ گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کی نیت پر کوئی شبہ بھی پیدا نہ ہو سکے۔

مثلاً لندن یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر علامہ ڈینیس سورا اپنی کتاب تاریخ الادیان میں قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بے سروپا اعتراضات اور اپنے ماقبل کے مستشرقین کی پھیلائی ہوئی جھوٹی باتوں کی پوری قوت کے ساتھ تردید کرتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں لندن سے

شائع ہوئی ہے وہ اپنے بیان میں اس قدر غیر متعصب اور بے لاگ مصنف نظر آتے ہیں کہ کسی کو ان کی نیت پر شبہ کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی بلکہ وہ اچھے خاصے عقیدت مند کی طرح بیان کرتے ہیں کہ

مذاہب کے عظیم بانیوں میں سے شائد محمدؐ ایک ہی شخص ہیں جن کی شخصیت تاریخی حیثیت سے بالکل واضح ہے اور خرافات نے ان کی شخصیت پہ کوئی پردۂ خفا نہیں ڈالا ہے۔

اور اس کے بعد عقیدت مندانہ انداز میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں کی تعریف کرتے ہیں بلکہ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں لیکن اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں:

بلاشبہ عرب کے لوگ جنوں اور روحوں کی پوجا کرتے تھے اور روحوں کے حجری مجسموں میں جاگزین ہونے کے قائل تھے۔ ان کے علاوہ قبیلہ قبیلہ کے الگ الگ بُت بھی ہوتے تھے۔ اسلام نے ان سب بتوں کو نیست و نابود کر دیا۔ صرف ایک "حجر اسود" کو باقی رکھا شائد اس لئے کہ اس سے حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کا احترام مقصود تھا یا شائد یہ ایک سیاسی عمل تھا جس کے ذریعہ عربوں کے باہمی اتفاق کو باقی رکھنا مقصود رہا ہو۔

{(ص۲۲۱) المستشرقون والاسلام مصنفہ زکریا ہاشم زکریا، طبع القاہرہ ۱۹۶۵ء}

آپ نے دیکھا کہ فاضل پروفیسر نے کس معصومیت کے ساتھ یہ یقین دلانے کی سعی فرمائی کہ رسول اللہؐ نے سیاسی مصلحت کی بنا پر ایک بُت کو باقی رکھا اور اس حد تک بُت پرستی کو اسلام میں جائز قرار دیا حالانکہ زمانۂ جاہلیت میں بھی جب کہ عرب میں سینکڑوں بتوں کی پوجا ہوتی تھی، کبھی حجر اسود کی پوجا نہیں ہوئی اور نہ اسے زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے زمرہ میں شامل سمجھا گیا۔ حجر اسود کا تو ذکر ہی کیا۔ اٹھارھویں صدی تک یورپ کے مستشرقین اور محققین یہ لکھتے رہے اور مشہور کرتے رہے کہ مسلمان جو ہر سال حج کو جاتے ہیں وہ اس لئے جاتے ہیں کہ خانۂ کعبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک برنجی بُت بنوا کر رکھ دیا ہے۔ مسلمان اس بت کو سجدہ کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں علمائے یورپ نے اس کی تردید کی اور ایک بار نہیں بار بار مختلف ممالک کے علماء نے اس کی تردید کی، تب یہ خیال لوگوں کے دلوں سے محو ہو سکا اور شائد دور افتادہ دیہاتوں میں اب تک موجود ہو۔

بہرحال جیسے جیسے علم کی روشنی پھیلتی گئی عربی کی کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتی رہیں اور یہ انتہائی ناحق شناسی ہوگی کہ عربی کتب کے اصل متون کی تصحیح و اشاعت اور

ان میں سے بہت سی کتابوں کے یورپین زبانوں میں ترجمہ کرنے کی جو عظیم الشان خدمت پچھلے پانچ سو سال کے اندر یورپ کے مستشرقین نے انجام دی ہے اس سے انکار کیا جائے یا ان کو کمتر درجہ کا کارنامہ قرار دیا جائے اس کے لئے سینکڑوں مستشرقین نے اپنی عمریں صرف کیں۔ حکومتوں اور بادشاہوں نے لاکھوں روپے خرچ کئے۔ دولت مندوں نے بڑے بڑے اوقاف قائم کئے اور آج عربی کی بڑی بڑی اہم کتابیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں، ان میں سے بہت سی کتابیں وہی ہیں جو انہی مستشرقین کی مساعی جمیلہ سے پہلی بار طبع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آسکی ہیں۔ اس طرح افتراء پردازی کا وہ بادل بھی آہستہ آہستہ چھٹ رہا ہے جو صدیوں تک قدیم مستشرقین اور پیشوایان دین کے بیانات اور ان کی تحریروں سے یورپین ذہنوں پر چھایا ہوا تھا۔ اب تحریروں کے انداز اور مستشرقین کے تحقیقات اسلامی کا طریقہ کسی نہ کسی قدر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ اب بھی مقاصد میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ پادری زویمر کے مقاصد تحقیقاتِ اسلامی اور ڈاکٹر کنٹویل اسمتھ کی تحقیقات میں مقاصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ دونوں کی تحقیقات کو دیکھ لیجئے۔ مقصد وہی استعماریت کی تائید اور اسلام کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی سعی ہے۔

چار ادوار مستشرقین یورپ کی اسلامی تحقیقات کو ہم سہولت کے لئے چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) پہلا دور، ابتدائے تاریخ اسلامی یعنی ساتویں صدی مسیحی یا گریگوری سے لے کر پندرھویں صدی مسیحی یعنی بیداری یورپ تک۔

(۲) دوسرا دور، پندرھویں صدی کی ابتدا سے اٹھارھویں صدی کے اختتام تک۔

(۳) تیسرا دور، انیسویں صدی کی ابتدا سے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے ختم یعنی ۱۹۲۵ء تک۔

(۴) چوتھا دور، ۱۹۲۶ء سے آج تک۔

(۱) دورِ اوّل میں یورپ کی حیثیت شاگردوں کی سی ہے اور مسلمانوں کی حیثیت استادوں کی سی۔ یہ دور تقریباً آٹھ سو سال کے طویل زمانہ پر مشتمل ہے۔ اس دور میں مسلمان اندلس میں، صقلیہ میں اور جنوبی ایطالیہ میں حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے ان کے بڑے بڑے علماء اور فلسفی ان علاقوں میں موجود تھے۔ اس وقت علم اور تمدن کے مالک مسلمان تھے۔ ان ہی کی تہذیب، تہذیب تھی اور ان ہی کے علوم' علوم سمجھے جاتے تھے۔

اس دور میں عیسائیوں کی ساری علمی زندگی پر ارباب کلیسا کا قبضہ ہے۔ پاپائے اعظم اور ان کے نائبین

مسلمانوں سے مختلف علوم حاصل کرنے کی سعی کرتے تھے اور عربی کتب و رسائل جمع کرتے تھے اسلامی قوانین کا تھوڑا بہت مطالعہ اس دَور کے آخری حصہ میں کیا گیا۔ طب۔ فلسفہ۔ فلکیات، زراعت اور قانون پر مسلمانوں کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی اور فرنچ زبانوں میں ہوا ابن رشد اور جابر بن اسحٰق اور ابن سینا کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ یہ کام عموماً ایطالیہ میں اور کسی قدر فرانس میں ہوا۔ لیکن نہایت دانائی کے ساتھ فارابی کو فارابس، ابن رشد کو ایوی راس، جابر کو جیبیر اور ابن سینا کو ایوی سینا بنا دیا گیا اور طلبہ کو یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ یہ لوگ یورپین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ اگرچہ یہ راز زمانۂ مابعد میں راز نہ رہ سکا لیکن یورپ کے کچھ نہ کچھ لوگ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ یورپین اور مذہباً مسیحی تھے۔

اس دَور میں مسلمانوں اور دین اسلامی سے متعلق بڑے عجیب عجیب ہیبت ناک قصے ارباب کلیسا کی طرف سے پھیلائے گئے کچھ مسلمانوں کی سفاکی کے قصے اور کچھ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بے سروپا قصے اسی زمانہ میں یورپ والوں کو باور کرایا گیا کہ مسلمان مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برنجی بت کو سجدہ کرنے کے لئے جایا کرتے ہیں۔

اسی زمانہ کے مستشرقین کبار میں سرفہرست جوبر دی اور الیاک ایک فرانسیسی راہب کا نام ملتا ہے۔ یہ فرانس میں ۹۳۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۰۰۳ء میں بمقام وٹیکن وفات پائی۔ اس نے اندلس کے مدارس میں برسوں رہ کر تعلیم حاصل کی اور اپنی قابلیت کی وجہ سے واپس آ کر بڑا نام پیدا کیا۔ واپسی پر وہ ایطالیہ میں مستقل اقامت گزین رہا حتیٰ کہ ۹۹۹ء میں وہ پاپائے اعظم کے جلیل القدر عہدہ پر منتخب ہو گیا۔ اس نے دو عربی مدرسے قائم کئے اور فلکیات و ریاضیات کی بعض کتابوں کے عربی ترجمے بھی کئے اس کے تراجم و تصانیف کا مجموعہ ۱۸۹۹ء میں برلن سے شائع ہوا ہے (نجیب العقیقی۔ المستشرقون ج ۱ ص ۱۲۰، طبع مصر ۱۹۶۴ء)

اس دَور کے مستشرقین میں اور الیاک کے علاوہ قسطنطین الافریقی المتوفی ۱۰۸۰ء اوجودی سانتا، دی کویل، ایڈبلارڈ، پطرس، یوحنا، رابرٹ، ہرمان، ڈینیل مورلے، میکل اسکاٹ، لیونارڈ، تھامس دی اکوین، روجر بیکن، ریمنڈ لیو، وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ یہ سب اندلس، صقلیہ اور دیگر اسلامی ممالک کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بہت سی عربی کتابوں کے فرنچ اور لاطینی میں ترجمے کرتے ہیں تقریباً یہ سب راہب یا کلیسا کے خدام ہیں۔ یہ لوگ کلیسا کی طرف سے مالی امداد پاتے اور استشراق میں

مشغول رہتے تھے

اسی دَور کا ایک بڑا فاضل اے تورمیدا بھی ہے جس نے ایطالیا میں تعلیم حاصل کی۔ بہت دنوں تک عیسائی خانقاہ کا مرشد اعلیٰ رہا اس کے بعد تونس چلا گیا وہاں صدق دل سے مسلمان ہو گیا اور عبداللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ تقریباً اسّی ۸۰ سال کی عمر میں ۱۴۳۲ء میں وفات پائی۔ اس کی قبر تونس میں باب المنارہ میں ہے (حوالہ سابق ص۱۳۲)

شیخ عبداللہ نورمیدا کے علاوہ اور بہت سے اطالوی اور فرنچ مستشرقین نے مطالعہ کے ذریعہ دین حق کو پالیا اور مسلمان ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے اسلام پر لاطینی اور فرنچ میں کچھ رسالے بھی لکھے تھے خدا جانے یہ رسالے اب کہیں موجود ہیں یا ضائع کر دیئے گئے۔

اس دَور میں یہودیوں نے قرآن مجید کے غلط نسخے تیار کر کے پھیلانے کی بھی ایک مہم چلائی جو کامیاب نہ ہو سکی اور ہر جگہ مسلمانوں نے ان کی تغلیط کی۔ اسی طرح قرآن مجید کو مشکوک قرار دینے کے لئے شام اور عراق کے یہودیوں اور عیسائیوں نے بہت سی جھوٹی روایتیں بھی پھیلائیں۔ کتابیں لکھ کر وفات پا چکنے والے بعض مسلمان علماء کی طرف منسوب کر دیں۔ اس زمانہ کے علماء نے اس کی تردیدیں کیں۔

(۲) دوسرا دَور جو یورپ کی بیداری یعنی پندرھویں صدی مسیحی سے اٹھارھویں صدی کے ختم تک تقریباً ۴۰۰ سال پر مشتمل ہے، دولتِ عثمانیہ ترکی کی اقبال مندی کا زمانہ ہے۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور بہت سے ممالک یورپ عثمانیوں کے زیر نگیں آ گئے۔ دوسری طرف یورپ میں عام بیداری پیدا ہوئی، کلیسا کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر طرح کی سیاسی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات شروع ہوئیں۔ اس زمانہ میں مستشرقین کے کارنامے بھی بہت زیادہ دکھائی دیتے ہیں اور ان کا لب و لہجہ بھی اسلام کے خلاف بہت ہی تلخ ہو جاتا ہے۔ یہ تلخی درحقیقت عثمانی فتوحات کے خلاف جذبات کی فراوانی سے پیدا ہوئی تھی۔

اس دَور میں ان کے کارنامے یہ ہیں کہ انھوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عربی کتابوں کے قلمی نسخے نکالے اور ان کو طبع کر کے شائع کیا۔ ان کے ترجمے کئے اور اس کے لئے بادشاہوں نے خزانوں کے دروازے کھول دیئے عالموں نے اپنی عمریں وقف کر دیں۔ ان کارناموں کے علاوہ خود یورپین زبانوں میں اسلام پر اس دَور میں بکثرت کتابیں لکھی گئیں اور مطبع کی ایجاد نے ان کتابوں کی بکثرت اشاعت کو آسان کر دیا۔

اس دَور میں یورپین اقوام نے مشرق کی سرزمین ایشیا و افریقہ پر قبضہ جمایا۔ مستعمرات اور

یورپین مقبوضات کا یہی زمانہ ہے انڈونیشیا، ملایا، ہندوستان، سومالیہ اور جنوبی، مغربی و مشرقی افریقہ پر نیدرلینڈ، فرانس، جرمنی، برطانیہ اور اطالیہ کے تسلط کی ابتدا اسی دور میں ہوئی۔ جن علاقوں پر ان مستعمرین نے قبضہ کیا تھا ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کی بڑی ہی نہیں بلکہ اکثریتی آبادیاں تھیں قبضہ اور تسلط قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کی زبانیں سیکھی جائیں۔ ان کے عقائد و روایات سے واقفیت حاصل کی جائے۔ ان کو آپس کے اختلافات میں الجھایا جائے۔ ان کی حمیت دینی کو کم کرنے کے لئے ان کے یقین کو شک سے بدل دیا جائے۔ ان کے ایمان و عقیدہ کو وہم اور غیر ثابت شدہ خیال قرار دیا جائے۔

ان مقاصد کے لئے یورپین ممالک خصوصاً فرانس اور جرمنی نے بڑی جدوجہد کی۔ اس وقت ان کے سامنے ایک اہم ترین مسئلہ یہ بھی تھا کہ دولتِ عثمانیہ کی قوت کو کس طرح توڑا جائے۔ اس کام کے لئے یہ ضروری تھا کہ عربوں اور ترکوں کے درمیان نہ صرف منافرت اور دشمنی پیدا کر دی جائے بلکہ اس منافرت کو دوامی صورت دے دی جائے۔ اس مقصد کے لئے فرانس کے بادشاہ لوئیس ۱۴ نے بے دریغ دولت صرف کی۔ مستشرقین اور مشرق شناسوں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر ان سے عربی قومیت، عربی تمدن، عربی رسم و رواج۔ اور عربوں سے متعلق دوسرے امور پر کتابیں لکھوائی گئیں عربوں کی تعریف و توصیف کے گیت گائے گئے۔

اس زمانہ کے مستشرقین کا بڑا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ وہ ایسے ثبوت فراہم کریں جس سے اس امر کی تائید ہو کہ عرب اسلام سے پہلے ہی بڑی عزت و شان کے مالک تھے۔ اسلامی تاریخ عربوں کے مجد و شرف کی تاریخ کا محض ایک باب ہے۔ اب تک جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہوتی تھی۔ عربوں کی الگ تاریخ کوئی نہیں لکھتا تھا۔ لیکن اس دور کی آخری دو صدیوں میں یورپین حکومتوں نے مستشرقین کے ذریعہ عربوں کو ترکوں کے خلاف کھڑا کرنے کی منظم جدوجہد شروع کی۔ عربی ممالک میں تحقیقاتی وفود کی ابتدا ہوئی۔ آثار قدیمہ نکالے جانے لگے اور عربوں کو وطنی قومیت کے لئے تیار کیا جانے لگا جس کا نتیجہ تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد بیسویں صدی کے اوائل میں خاطر خواہ نکلا۔

اسی دور کی آخری دو صدیوں میں اسلام کے خلاف کتابوں اور رسائل کی تالیف و اشاعت کا کام الطالب ... محدود نہ رہا بلکہ ان ہی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذریعہ یورپ کے دوسرے ... گیا خصوصاً جرمنی اور نیدرلینڈ میں مطابع قائم ہوئے اور لوگ اس سلسلہ میں کام کرنے

لگے۔ آخر میں انگلستان میں بھی تعلیمی اور اشاعتی ادارے قائم ہوگئے۔

اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں اوّلین نام مسٹر جی پوسٹل کا آتا ہے۔ یہ نارمنڈی کے ایک قصبہ بارنٹون میں ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۸۱ء میں وفات پائی۔ ان کو بادشاہ وقت نے جاگیر بھی دی تھی۔ انھوں نے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے سفر کئے، بہت سی قلمی کتابیں خریدیں اور عربی و عبری زبان دانی اور مسلمانوں کے عقائد و رسوم پر متعدد کتابیں لکھیں۔ یہ ایک مذہبی پیشوا تھے اور آخر عمر میں مذہب عیسوی میں بعض نئی باتیں پیدا کرنے کے جرم میں حکومت فرانس نے انہیں قید کر دیا تھا ان کی وفات بھی قید خانہ میں ہوئی۔ ان کے علاوہ اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں بی وبٹیر (۱۶۱۳ء - ۱۶۶۷ء) بی ڈی بربلیو (۱۶۲۵ء - ۱۶۹۵ء) انطون گالان (۱۶۴۶ء - ۱۷۱۵ء) پادری رینا ڈو (۱۶۴۷ء - ۱۷۲۰ء) اور پادری بارتیلمی (۱۷۱۶ء - ۱۷۹۵ء) وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں اسلام پر کتابیں لکھیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ کلیسا کا طلسم ٹوٹا اور اس دور کے آخر میں کچھ ایسے مستشرقین بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے پیشرو مستشرقین کی تردید کی۔ لیکن ان میں سے اکثر نے کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دیئے۔

(۳) تیسرا دور انیسویں صدی کی ابتدا سے ۱۹۲۵ء تک۔

اس دور میں عربی کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کا کام زیادہ وسعت کے ساتھ ہوا۔ یورپ کی تقریباً ہر بڑی یونیورسٹی میں عربی زبان اور اسلام کے مطالعہ کے لئے خاص شعبے قائم ہوئے۔ عربوں اور ترکوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی مہم بہت تیز کر دی گئی۔ اسلامی کتابوں کے ترجمے بکثرت شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں اسلامی تحقیقات کے نام سے اندرونی اختلاف اور جدید فرق اسلامیہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ عربی قلمی کتابوں کی تشریحی فہرستیں شائع ہوئیں۔ تقریباً ہر ملک میں ایشیائی سوسائٹیاں وجود میں آئیں۔

اس دور کے مستشرقین عربی متون کی تصحیح اور علوم ریاضیہ و تجربیہ کے تراجم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دو مقاصد کے لئے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ عربوں اور غیر عربوں میں تفریق کے لئے عربوں کی تعریف و توصیف اور غیر عرب مسلمانوں پر الزامات۔ دوم یہ کہ مسلمانوں کی روایات اور ان کی تاریخ کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی مساعی۔

اس دور میں قرآن مجید کے متعدد ترجمے ہوئے۔ قرآن مجید کے الفاظ کی فہرستیں اور لغات القرآن

بکثرت تیار کئے گئے۔ مسٹر جی فلوگل (۱۸۰۲ء - ۱۸۷۰ء) اور مسٹر ہملٹین المتوفی ۱۸۸۴ء مترجم ہدایہ اسی دَور کے علماء ہیں۔

اس دَور کے مشہور مستشرقین میں سے ایڈورڈ رہباٹسک (۱۸۱۹ء ۱۸۹۱ء) مسٹر ہیوز مصنف ڈکشنری آف اسلام، تھامس کارلائل، ولیم ہوک مارلے، ایڈورڈ مہلر، ایل اسمتھ، پادری ڈروم، سی ای ولسن گولڈزیہر، پادری کموشکوئ، جان جاک سدیو، لیونے کایتانی، پادری فاکاری، لازینون، بلاشیر اور نالینو وغیرہ ہیں۔ نامی گرامی پروفیسر پامر اور ان کے لائق شاگرد کرنل لارنس اسی دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس دَور میں تحقیقاتِ اسلامی کا کام جن مستشرقین نے کیا ان میں نولدیکے اور ان کے شاگرد علامہ بروکلمان اور پروفیسر سخاؤ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح تھامس ارنلڈ مسٹر جیکبن، مونٹ گمری واٹ، پروفیسر گوہام لی اسٹورنج، مسٹر لیمب، مسٹر انڈرسن، پروفیسر مار گولیتھ، ڈینی راس، مسٹر اولیری مسٹر لوکارٹ، مسٹر براؤن، مسٹر بنورسکی، مسٹر ٹریٹن، مسٹر ابولوف، مسٹر گیریان، مسٹر ہمیلٹن گب، مسٹر لنڈاؤ اور مسٹر لوئیس وغیرہم نے تحقیقاتِ اسلامی کا کام کیا اور کر رہے ہیں۔ پادری زویمر المتوفی ۱۹۵۲ء بانی رسالہ مسلم ورلڈ بھی اسی دَور کے ہیں۔

اس دَور میں تحقیقاتِ اسلامی کا دائرہ فقہ و اصول فقہ تک وسیع ہو گیا۔ اسلامی فرقوں کے حالات اور ان کے افکار کی طرف توجہ بڑھا دی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ان موضوعات پر کچھ نہ کچھ کام مستشرقین نے کیا ہے۔ مگر اس عہد میں توجہ ان موضوعات اور تصوفِ اسلامی کی طرف زیادہ ہو گئی ہے۔

اس دَور میں ایک بات یہ پیدا ہو گئی کہ بڑی بڑی حکومتیں خدا بیزاری اور مذہب سے نفرت کے اصول پر قائم ہو گئی ہیں اس کی طرف توجہ ۱۹۲۵ء کے بعد سے ہوئی اور ۱۹۴۵ء کے بعد تو خدا بیزار مملکتوں کا مسلسل پروپیگنڈہ عیسائیت، اسلام بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا اس لئے باستثنائے چند مستشرقین یورپ کا لب و لہجہ اسلام کے خلاف یاوہ گوئی میں نسبتاً نرم ہو گیا اور اسی وجہ سے مذاہب کی کانفرنسوں، تقریروں اور مقالات صلح و آشتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس صورت حال کا اثر سب پر نہیں پڑا اور پادری سموئل زویمر اور ان کے ہمنوا پوری قوت کے ساتھ اسلام، قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لکھتے رہے۔ ان کے لب و لہجہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی۔ مگر پھر بھی دیگر مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنی تحریروں

کو مصلحتہً کسی قدر نرم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

مستشرقین کے مقاصد کسی ذی ہوش آدمی کا ارادی عمل بغیر علت غائی یعنی مقصد عمل کے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ مستشرقین کا عمل اسلامی تحقیقات کسی مقصد کے بغیر ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ تمام محنت نیز حکومتوں اور اوقاف کی طرف سے اتنے بڑے پیمانہ پر جد و جہد بغیر کسی مقصد کے نہیں، ضرور اس کے پیچھے کوئی غایت ہونا ہی چاہیئے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف تلاش علم ہے۔ لیکن یہ خیال اس لئے محض باطل ہو جاتا ہے کہ ہم قدیم زمانہ سے اس کام میں زیادہ تر ان ہی حضرات کو منہمک پاتے ہیں جو عیسائیت کے پُر جوش مبلغین ہیں جو نہ صرف اپنے جذبات سے مخالف اسلام ہیں بلکہ وہ اس کام کے لئے گراں قدر تنخواہیں بھی پاتے رہے ہیں اور آج تک اکثریت ان ہی مبلغین کی اس میں مشغول نظر آتی ہے جو دین مسیحی کے بہترین مبلغ ہیں۔ ذرا چند ناموں پر غور کیجئے۔ یہ سب مسیحی پادری ہیں اور مدتوں تک مرتاض راہب رہ کر تربیّت حاصل کر چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کلیسائی نظام اور مذہبی اوقاف سے بڑی بڑی تنخواہیں ان کو ملتی رہی ہیں۔

پادری الیانو المتوفی ۱۵۸۹ء	پادری ریلو المتوفی ۱۸۴۸ء
پادری مارٹن المتوفی ۱۸۸۰ء	پادری بلن المتوفی ۱۸۹۱ء
پادری ابوجی المتوفی ۱۸۹۵ء	پادری کوشش المتوفی ۱۸۹۵ء
پادری ڈی کوپر المتوفی ۱۹۰۴ء	پادری جولیان المتوفی ۱۹۱۱ء
پادری بوویر المتوفی ۱۹۱۶ء	پادری میکارتھی المولود ۱۹۱۳ء
پادری بولوموائے المتوفی ۱۹۲۶ء	پادری زیموفین المتوفی ۱۹۲۸ء
پادری ڈیورنڈ المتوفی ۱۹۲۸ء	پادری مالون المتوفی ۱۹۳۴ء
پادری لامنس المتوفی ۱۹۳۷ء	پادری کولنگیٹ المتوفی ۱۹۴۳ء
پادری لاپیرے المتوفی ۱۹۵۰ء	پادری مونٹرڈے المولود ۱۸۸۰ء
پادری ہنری چارلس المولود ۱۹۰۰ء	پادری فلیش المولود ۱۹۰۴ء

یہ سب مبلغ اور پادری ہیں اور کلیسا کے عہدہ دار ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک مسیحی راہب اور کلیسا کا عہدہ دار کلیسا کی تنخواہ لے کر اسلام پر تحقیقات کس مقصد

اور کس جذبہ کے ماتحت کر سکتا ہے۔ اور یورپ کی استعماری حکومتوں نے ان پر جو کروڑوں روپے خرچ کئے یا کر رہی ہیں، ان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ عربی زبان سے ریاضیات، فلکیات، کیمیا، طب، نباتیات اور حیوانیات کی کتابوں کے ترجمے کرنے والوں کو شائد یہ کہہ دیا جائے کہ محض تلاش علم کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں یا کرتے رہے ہیں لیکن ایسے حضرات بہت ہی کم ہیں اور ہمارے مقالہ کے موضوع سے خارج ہیں۔ اسلامی عقائد قرآن حکیم، اسلامی تاریخ، سیرۃ رسولؐ اور اسلامی تصوف پر تحقیقات کرنے والے مسیحی خانقاہ نشینوں، مبلغوں اور یہودی عالموں کا مقصد صرف تلاش ہو، اسے کون باور کر سکتا ہے؟

مستشرقین کی اسلامی تحقیقات کا مقصد جو اِن کی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈہ، استعمار کے لئے راستہ کی ہمواری اور مسلمانوں میں تفریق پھیلانے کی جدو جہد کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ بڑے خلوص اور زندہی سے کام کرتے ہیں۔ تحقیق کے نام سے منافقوں اور اسلام دشمن اشخاص کے قدیم اقوال ڈھونڈھ کر نکالتے ہیں اور چونکہ عرب عیسائیوں اور یہودیوں کے اکثر نام مسلمانوں کے سے ہوتے ہیں۔ اس لئے بڑی آسانی کے ساتھ وہ دھوکا دینے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ مسلمان حکومتوں میں ہمیشہ سے آزادیٔ رائے رہی ہے اس لئے ہزاروں یہودیوں اور عیسائیوں نے طرح طرح کی فضول اور مضر تحریریں لکھی ہیں اور آج یہ تحریریں اس طرح پیش کی جاتی ہیں جیسے کسی مسلمان عالم دین کی لکھی ہوئی کتابیں ہوں۔ اس کے علاوہ خود مسلمانوں میں لا مذہب اور زندیق قسم کے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یہ لوگ ان کی تحریروں پر خاص توجہ کرتے ہیں مثلاً بشار بن برد اور ابو نواس جیسے مشاہیر فساق اور زنادقہ کی تحریریں یا کتاب الاغانی، کتاب اخوان الصفا، ابو نعیم کی کتاب الفتن اور اس قسم کی دوسری کتابوں سے مواد لیتے ہیں۔ بعض بالکلیہ جعلی کتابیں جو کسی قدیم مصنف کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن ابی داؤد کی طرف منسوب کتاب المصحف، زبیر بن بکار کی طرف منسوب کتاب نسب قریش، بو علی سینا کی طرف منسوب رسالہ حشر الاجساد وغیرہ ان کے مقاصد کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ متون کتاب کی طباعت و اشاعت میں انھوں نے جو کام کیا ہے فہرست سازی اور اشاریہ نویسی میں جو محنتیں انھوں نے کی ہیں وہ لائق صد آفرین ہیں ان کی محنت و مساعی سے بہت سی نایاب اور قیمتی کتابیں چھپ کر ہمارے لئے قابل حصول ہو گئیں۔ لیکن جہاں انھوں نے

ترجمہ و تحشیہ کا کام کیا ہے. یا خود کوئی کتاب اسلام پر لکھی ہے. وہاں کبھی بالارادہ اپنے جذبۂ عداوت کے ماتحت اور کبھی محض اپنی جہالت سے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں. مثال کے لئے مشہور مستشرق فلوگل کو لیجئے. انھوں نے قرآن مجید کا ایک نسخہ چھاپا، الفاظ کی فہرست مرتب کی اور ۱۸۴۲ء میں ایک وسیع لغت الفاظ قرآن مجید کا شائع کیا. اس لغت میں انھوں نے ۳۹ الفاظ کے غلط عربی مادے لکھ دیئے اور نتیجۃً معانی بدل ڈالے مثال کے لئے ان پانچ الفاظ کو دیکھئے.

(۱) اثرن کا مادہ ا۔ ث۔ ر قرار دیا. حالانکہ اس کا صحیح مادہ ث۔ و۔ ر ہے.

(۲) المخاض کا مادہ خ۔ و۔ ض قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ م۔ خ۔ ض ہے۔

(۳) استیقوا کا مادہ ب۔ ق۔ ی قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ س۔ ب۔ ق ہے.

(۴) قرن۔ کا مادہ ق۔ ر۔ ن قرار دیا. حالانکہ اس کا مادہ ق۔ ر۔ ر یا و۔ ق۔ ر ہے.

(۵) مقیلا۔ کا مادہ ق۔ و۔ ل قرار دیا. حالانکہ اس کا صحیح مادہ ق۔ ی۔ ل ہے.

اسی طرح ۳۹ الفاظ میں غلطی کی اور یہ محض نقص مطالعہ کی وجہ سے ہوا. حالانکہ اہل یورپ کے نزدیک جناب فلوگل کا مقام سند مستند کا ہے.

چونکہ ہمیشہ سے دین مسیحی پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ انجیل مقدس کے نام سے جو کتاب پیش کی جاتی ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی غلط اور فرضی سوانحعمری ہے. اس میں ایک لفظ بھی وحی الٰہی کا نہیں ہے. اور یہ اعتراض بالکل صحیح ہے. دنیا میں کہیں وحی الٰہی کا ایک لفظ بھی ماسوا قرآن مجید کے موجود نہیں ہے. یہ امر واقعہ ہے اس کا کوئی جواب نہ عیسائی مبلغین کے پاس ہے اور نہ یہودی احبار کے پاس. اس لئے مستشرقین نے اپنی اسلامی تحقیقات کا سارا زور اس پر لگا دیا ہے کہ قرآن مجید بھی اصلی نہیں اور قابل اعتماد نہیں ہو سکتا. اس کے لئے عجیب عجیب دلائل پیدا کرتے ہیں. مثلاً علامہ گولڈ زیہر اپنی کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے ایک لفظ کی صحت بھی یقینی نہیں ہے، کیونکہ ابتداءً جب اسے لکھا گیا تو حروف پر نقطے نہیں تھے. اس لئے لوگوں نے نہ جانے کیا لکھا تھا اور کیا پڑھا.

ذرا غور فرمائیے اس فاضل مستشرق نے کیا بات پیدا کی ہے. جس قوم میں مادر زاد اندھے حافظ رہے ہوں اور جس میں آج تک استاذ سے شاگرد کی طرف علم کی منتقلی بذریعہ صوت ہو اس میں نقطہ کی اہمیت کیا ہے، صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے آواز سنتے تھے یا لکھی ہوئی تحریروں

سے قرآن مجید یاد کرتے تھے؟ اور آج تک کس مسجد اور کس مدرسہ میں قرآن مجید بغیر معلم کی آواز کے بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھا جاتا ہے؟ قرآن مجید کی آواز، مد، سکون، وقف، سکتہ یہ سب بذریعہ روایت محفوظ ہے۔ اس کے لئے حروف اور نقطہ کی ضرورت کہاں پڑتی ہے؟ شائد علامہ گولڈ زیہر کا مقصد یہ ہے کہ جب وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لکھوا کر اس لئے محفوظ فرما دیتے کہ لوگ آکر مسجد میں رکھے ہوئے اس نوشتہ کو پڑھ لیا کریں اور آپؐ کسی کو زبان سے کچھ نہیں سنایا کرتے تھے۔ پھر حضرت عبداللہ بن ام کلثومؓ جیسے نابینا صحابی کیسے قرآن مجید پڑھتے۔ اور ناخواندہ تو ہزاروں ہی تھے، انھوں نے قرآن مجید کیسے یاد کیا؟ ؎[1]

اسی طرح کی مہمل دلیلوں اور مغالطوں کے ذریعہ حضرات مستشرقین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تورات مقدس اور انجیل مقدس کی طرح قرآن مجید بھی دنیا سے ناپید ہو گیا۔ اسی طرح سیرۃ طیبہ اسلامی تاریخ اور فقہ اسلامی میں طرح طرح کے شک پیدا کرنے کی کبھی بالارادہ کوشش کرتے ہیں۔ اور کبھی نقص مطالعہ اور غرور علم وفضل کی آمیزش سے ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں۔

سنیئے ایک مستشرق مبلغ لوئی ونڈرمین ہیں انھوں نے ایک علمی مجلس میں یہ اعتراض کیا کہ ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ کے گھر حضرت زبیرؓ اکثر جاتے تھے اور کبھی کبھی وہیں سو بھی جاتے تھے۔ ام المومنینؓ ان کے سر میں کنگھی بھی کر دیتی تھیں۔ حالانکہ اسلام میں کسی عورت کا غیر مرد سے اس طرح خلاملا جائز نہیں ہے۔

؎[1] قرآن مجید کا نام جس طرح القرآن (پڑھی جانے والی کتاب) ہے، اسی طرح الکتاب (لکھی جانے والی کتاب) بھی ہے۔ اسے ایک طرف اگر زبانی ایک دوسرے کو منتقل کیا جاتا تھا تو دوسری طرف تحریری شکل میں بھی منتقل کیا جاتا تھا، کسی زبان میں کتابت اور رسم الخط کے وجود کے معنے ہی یہ ہیں کہ اس میں معانی کو منتقل کرنے کے لئے تحریری طریقہ موجود ہے۔ رسول اللہؐ کے عہد میں عربی رسم الخط پڑھنے والوں کے لئے اتنا ہی واضح اور متعین تھا جتنا آج ہمارے لئے موجودہ مصاحف کا رسم الخط ہے، جس طرح ہمارے ہاں بعض تحریروں میں نہ حرکت وسکون ہوتے ہیں اور نہ نقطے لیکن انہیں وہ لوگ بالکل صحیح پڑھتے ہیں، جو اس کی مزاولت کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح عہد رسالت مآبؐ کی تحریر بھی اس کے جاننے والے بغیر کسی غلطی کے بالکل ٹھیک پڑھ لیتے تھے۔ (مدیر)

اس اعتراض کے بعد جب انہیں بتایا گیا کہ حضرت ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ حضرت زبیرؓ کی حقیقی پھوپھی تھیں اور ان ہی نے بچپن سے ان کو پالا تھا، کوئی غیر نہ تھیں، تو نہایت معصومیت سے وہ بولے "اچھا تو یہی بات ہوگی"۔

مثالوں سے یہ بات بڑی طویل ہو جائے گی۔ اس لئے اب میں اس گفت گو کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) عیسائیوں اور یہودیوں کو ہمیشہ ہی سے اس کا صدمہ رہا ہے کہ اسلام نے شام و عراق، مصر و مراکش وغیرہ میں کیوں قدم جمالئے۔ اس کا انتقام لینے کے لئے انھوں نے تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی کام لیا اور کام لے رہے ہیں۔ اور ہمیشہ وہ کام لیتے رہیں گے۔ مسلمانوں کو چوکنا رہ کر اپنا دفاع کرنے کی ضرورت ہے۔ ان سے کوئی شکایت فضول ہی نہیں بلکہ بزدلی بھی ہے۔

(۲) عیسائی مبلغین جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں وہ حقیقتاً کسی مذہب کے مبلغ نہیں ہیں۔ کبھی وہ استعماری حکومتوں کے ہراول دستے تھے اور اب یورپین تہذیب و تمدن کے نقارچی ہیں جنہیں بیش قرار تنخواہیں سیاسی مصالح اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لئے دی جاتی ہیں۔ یہ مبلغ بھی ہوتے ہیں، اور پروفیسر بھی۔ اور کبھی کوئی منسر اروپ بھی دھار لیتے ہیں۔

(۳) کسی کی بات کو بغیر تنقیح و تحقیق کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے مستشرقین کے علم و فضل سے مرعوب ہو کر کوئی بات نہیں قبول کی جا سکتی۔ رہی اچھی اور سچی بات تو یہ دشمن سے ملے یا دوست سے

کلمۃ الحق ضالۃ المومنین اینما وجدت فھو احق بھا۔

(سچی بات مومن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں ملے وہ (مومن) اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔)